(غلام گردش)

مٹی کے چراغ

انجانا خوف کسی بھی معاشرہ کے لیے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔خوف ملکی سطح پر بھی تخلیقی اور معاشی صلاحیتوں کو صلب کر لیتا ہے۔وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو،اس دیو کے سر کو اپنی ہمت کی تلوار سے اڑا کر رکھ دیتی ہیں۔ہمارے ہاں ان گنت لوگ ہر وقت یاس اور نا امیدی پھیلانے کی مہم کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔آفرین ہے ہماری قوم پر،کہ وہ ہر نا امیدی کے گھپ اندھیرے میں جگنو بن کر نکلتی ہے اور روشنی بن کر ہر رات کو پھر صبح میں تبدیل کر دیتی ہے۔

میں کراچی میں تین دن گزار کر آج ہی لاہور واپس پہنچا ہوں۔اس دوران میں ہر اُس آبادی،کالونی اور سڑک پر پھرتا رہا ہوں جس کے متعلق ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ یہاں قاتل ہاتھوں میں اسلحہ لیے لوگوں پر گولیاں برسانے میں مصروف ہیں اور لوگوں کو مکھیوں کی طرح مار رہے ہیں۔یہ مفروضہ مکمل حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔کراچی صدر،نورتھ ناظم آباد،گولی مار،پٹیل پاڑہ اور ہر جگہ ہزاروں لوگ اپنے اپنے کاروبار زندگی میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔ہر دکان پر گاہکوں کی قطاریں موجود ہیں۔ٹریفک کا ایک سیلاب ہے جس میں پوری رات روشنیاں ہر طرف زندہ رہتی ہیں۔یہ عظیم شہر چوبیس گھنٹے جاگتا ہے۔شادی گھروں کی قطاروں میں درجنوں تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں۔میں ایک تقریب سے رات ایک بجے کے بعد واپس آیا۔مجھے کسی بھی جگہ خوف کی کوئی پرچھائی تک نظر نہیں آئی۔سمجھنے کی بات یہ ہے کہ دو کڑوڑ سے زیادہ آبادی کے،اس شہر نے خوف کو مکمل شکست دے رکھی ہے۔کوئی ہنگامہ اور کوئی فساد اس پر قابض نہیں ہوسکتا۔یہ درست ہے کہ دن میں کئی لوگ بے موت مارے جاتے ہیں مگر یقین فرمایئے اس عظیم شہر میں زندگی اپنی خوبصورت رفتار سے رواں دواں رہتی ہے۔

نور علی پشاور میں مقیم ایک سرکاری افسر ہے وہ مجھ سے دو سال سینئر ہے۔میں اُس سے صرف چند ماہ سے شناسا ہوں۔میری اور اس کی پہلی طویل ملاقات پشاور کے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل (P.C) میں ناشتہ کے دوران ہوئی۔وہ تقریباً چالیس منٹ بولتا رہا۔اُس میں بتاتا رہا کہ بطور D.C.O (ڈی۔سی۔او) وہ نوشہرہ رہا۔پھر وہ اپنے سرکاری مسئلے مسائل بتاتا رہا۔مجھے اُس کی کوئی بات بھی دلچسپ نہ لگی بلکہ چند منٹ بعد میں اُکتا گیا۔وہ مسلسل بولتا رہا۔اور میں بغیر سنے سر ہلاتا رہا۔کچھ ماہ بعد میں اور نور علی اکھٹے ویت نام اور چین گئے۔جہاز میں ہم دونوں کی سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔اب میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔نور علی نے میرے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔میں اس کی باتوں کی سچائی سے پگھلنا شروع ہو گیا۔اُس کے بعد میں کئی جگہ بہانہ بنا کر اُس سے باتیں کرنے لگتا تھا۔نور علی کو پاکستان سے دیوانوں کی مانند عشق ہے۔وہ اس ملک کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتا۔صوبہ خیبر پختونخواہ جس میں امن وامان کی صورت حال بہت بہتر نہیں ہے مگر وہ اس سے باہر نہیں رہنا چاہتا۔حیات آباد کے تقریباً متصل اُس کا چھوٹی سی گلی میں سات آٹھ مرلے کا گھر ہے۔واحد ذاتی گاڑی ایک سوزوکی ہے جسے وہ کم سے کم چلاتا ہے کیونکہ پٹرول بہت مہنگا ہے۔وہ سرکاری گاڑی استعمال کرتے ہوئے بھی کتراتا ہے کیونکہ اُس کا ایندھن سرکاری ہوتا ہے اور سرکار کا پیسہ اُس کے نزدیک ایک بہت بھاری امانت ہے۔یہ بوجھ اٹھانا اُس کے بس سے باہر ہے۔ایک سرکاری تقریب میں وہ بالکل میرے ساتھ کھڑا تھا۔مہمان خصوصی کی آمد پر پاکستان کا قومی ترانہ بجایا گیا۔ہم سب کھڑے ہو گئے۔جیسے ہی ترانہ شروع ہوا،نور علی کی

حالت غیر ہونی شروع ہوگئی۔اُس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔جب قومی ترانہ ختم ہوا تو نور علی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔اگر کچھ اور وقت کھڑا رہنا پڑتا تو شائد وہ زمین پر گر جاتا۔کہنے لگا کہ قومی ترانہ اُس کے جسم اور روح کے ایک ایک تار پر اثر کرتا ہے۔ترانے کے جملے اُس کے خون اور رگوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔اس کی آنکھوں سے خود بخود پانی کا دریا رواں ہو جاتا ہے۔اس کو اپنے ملک سے اتنی محبت ہے کہ ترانہ اُس کو ذہنی طور پر ایک وجد میں مبتلا کر دیتا ہے۔میں نے سرکاری ملازمت میں ملک سے ایسا جذباتی لگاؤ اور عشق کی اس منزل پر بہت کم لوگوں کو مقیم پایا ہے۔

نور علی ایک سادہ سا آدمی ہے۔اسکے مالی وسائل پاکستان کی اِس نوکری یعنی P.A.S (پاکستان ایڈمنسٹریٹیو سروس) میں جس میں کچھ سرکاری افسر ارب پتی ہیں، بہت ہی محدود ہیں۔اس کے پاس اتنے کم وسائل تھے کہ اپنے بیٹے کی شادی بھی اس نے اپنے گاؤں میں منعقد کی۔چار پایوں پر بارات بٹھائی گئی۔اگلے دن بڑا سادہ سا ولیمہ ہوا۔وہ کہتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے گاؤں واپس چلا جائے گا کیونکہ پشاور ایک مہنگا شہر ہے اور وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ اتنے مہنگے شہر میں رہنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

صالح محمد لائل پور کی جناح کالونی میں رہتا تھا۔اُس کے والد بچپن میں فوت ہو گئے۔وہ گورنمنٹ کے عام سے سکول میں پڑھتا رہا۔وسائل نہ ہونے کی وجہ سے کالج نہ جا سکا اور تعلیم کا سلسلہ مجبوراً بند کرنا پڑا۔صالح محمد میں حیرت انگیز صلاحیتیں تھیں۔وہ کچی پنسل سے کاغذ پر لوگوں کی تصویر بنانے لگ گیا۔پھر اُس نے نادر سینما کے باہر ایک پینٹر سے دوستی کر لی اور مصوری سیکھنے لگا۔چند ہی سالوں میں اسے اس آرٹ پر عبور ہو گیا۔وہ مختلف رنگوں سے چند ہی دنوں میں بڑی بڑی تصاویر بنا دیتا تھا۔اسے کسی نے لاہور میں نیشنل کالج آف آرٹس (N.C.A) کا بتایا۔N.C.A میں داخل ہونے کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔مگر وہ اُس کالج کے ایک پروفیسر کا شاگرد ہو گیا۔وہ اس کی گاڑی صاف کرتا تھا۔پروفیسر کے ذاتی کام کرتا تھا۔مصوری کے اس استاد نے صالح محمد کے کام میں نفاست بھر دی۔استاد نے اُس کا برش سیدھا کر دیا۔اب صالح محمد حقیقت میں ایسی تصاویر بناتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ تصویر نہیں بلکہ بالکل اصل ہے۔اُس نے اپنے گھر میں پاکستان کے جھنڈے کی ایک بہت خوبصورت تصویر بنائی ہوئی تھی۔وہ اس تصویر کی طرف کبھی پشت نہ کرتا تھا۔وہ جھنڈے کی تصویر کی طرف پیر کر کے سوتا بھی نہیں تھا۔چودہ اگست کو وہ اپنے گھر کے باہر سبز اور سفید چونے کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بناتا تھا۔بچوں کی کھیلنے والی ٹرین پر وہ قائداعظم، لیاقت علی خان اور تحریک پاکستان کے مختلف رہنماؤں کے پتلے بنا کر مختلف ڈبوں میں سجا دیتا تھا۔یہ ٹرین پورے ایک دن محلے کے تمام بچوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتی تھی۔اُس نے سفید رنگ کا مزار قائد بھی بنایا ہوتا تھا۔ٹرین وہاں جا کر رُک جاتی تھی۔بچوں کی ٹرین کا وہ آخری سٹیشن ہوتا تھا۔چودہ اگست کو وہ کئی بار اپنے بنجو پر پاکستان کا قومی ترانہ بجاتا تھا۔

لاہور ہی میں وہ خواجہ خورشید انور کی محفلوں میں جانے لگ گیا۔وہاں اُس نے راگ، راگنیاں اور سازوں کی تعلیم حاصل کی۔وہ ہر دوسرے دن لائل پور آ جاتا تھا اور چند دن قیام کر کے پھر لاہور چلا جاتا تھا۔فن موسیقی کے سیکھنے کا دیوانہ وار شوق اسے تھکنے نہیں دیتا تھا۔اُس کو بنجو بجانا پسند تھا۔آپ کوئی گانا بتایئے وہ اپنے ساز پر آپ کو وہ دھن بہت سریلے طریقے سے بجا کر حیران کر دیتا تھا۔بہت دور دور سے لوگ اسے سننے کے لیے آتے تھے۔اُس نے ریل بازار میں ایک کپڑے کی دکان بنائی۔چند سال بہت اچھے گزرے۔پھر اُس چھوٹی سی

دکان پر ایک سابقہ وفاقی وزیر نے قبضہ کرلیا۔اُس وفاقی وزیر کا اثر رسوخ اتنا زیادہ تھا کہ وہ کسی عدالت سے اپنا کیس نہ جیت سکا۔صالح محمد کہتا تھا کہ اُس ملک نے اسے سب کچھ دیا ہے۔وہ ہر وقت شکر ادا کرتا رہتا تھا۔ایک دن وہ میرے پاس آیا۔اُس کے ہاتھ میں شطرنج کا بورڈ تھا۔ہم کھیلنے لگ گئے۔چند منٹ بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کھیل میں بہت مشق رکھتا ہے۔تھوڑی دیر میں اُس نے مجھے شطرنج میں ہرا دیا۔میرے ضد کرنے پر وہ کہنے لگا کہ لائل پور میں اُس نے یہ کھیل ایک گونگے شخص سے سیکھا ہے۔مجھے بعد میں پتہ چلا کہ صالح محمد پاکستان کا کئی سال چیس ماسٹر (Chess Master) رہا ہے۔اُس کے مالی وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہ بین الاقوامی سطح پر شطرنج کے کسی مقابلہ میں حصہ لے سکتا۔ایک سال پہلے وہ ایک ٹریفک حادثہ کا شکار ہوگیا۔

اعتزاز حسن اپنے سکول میں تاخیر سے پہنچا تھا۔اُس کے استاد نے لیٹ آنے پر اسے اسکول سے باہر نکال دیا تھا۔دو ہزار بچہ صبح کے وقت اُس بلڈنگ میں موجود تھا۔اعتزاز نے دیکھا کہ ایک آدمی تیزی سے سکول کی طرف بڑھ رہا ہے۔اسے لگا کہ یہ کوئی خودکش حملہ آور ہے۔اپنے دوستوں کے منع کرنے کے باوجود اعتزاز نے اُس بمبار کو پکڑ لیا۔اس نے اپنی جیکٹ کھول دی۔اعتزاز حسن اُس حملے میں سکول کے بچوں کو بچاتے ہوئے شہید ہوگیا۔اعتزاز تو خود بچہ تھا۔ابراہیم زئی میں اس واقعہ نے اعتزاز کو اَمر کر دیا۔وہ اکثر کھیلتے ہوئے دوسرے بچوں سے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنے ملک کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔اُس نے واقعی اس ملک پر اپنی جان نچھاور کر دی۔جب بھی میں میڈیا پر دانشوروں کو مایوسی پھیلاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں ان تینوں لوگوں کا عکس آجاتا ہے۔میں بالکل مطمئن ہوجاتا ہوں۔جب تک ہمارے پاس نور علی، صالح محمد اور اعتزاز حسن موجود ہیں، ہم ناقابل تسخیر ہیں۔کیونکہ یہ اور ان جیسے لاکھوں لوگ اس ملک کے اِردگرد وہ فصیل ہیں جس میں کوئی بھی رخنہ نہیں ڈال سکتا۔بیشک انسان مٹی کا پتلا ہے مگر یہ لوگ مٹی کے وہ چراغ ہیں جو ہمیں منزل کا نشان بتاتے ہیں۔

راؤ منظر حیات

Dated:12-01-2014